رشید امجد کے افسانوں میں وجودی عناصر کا تجزیاتی مطالعہ

غزل یعقوب*

Abstract:

The paper describes the historical back ground of modernism and existentialism. It is tried to probe that how western modernism has entered into the Urdu literature. While introducing the five basic elements of modernism, it has been analysed that how these elements reflected directly and indirectly in the short stories of Rasheed Amjad. It also analysed that though the elements of symbol is dominated in his short stories, however his symbols profoundly become part of the debate of existentialism.

جدیدیت نے جب عروج پایا تو نتیجے میں فرد تنہائی، بے اطمینانی اور شدید کرب کا شکار ہو گیا۔ اجتماع کی بات کرتے کرتے فرد اپنی شناخت کھو بیٹھا۔ تنہائی اور مایوسی کے عالم میں جب اس کی بے چینی حد سے بڑھی تو وجودی فکر نے سر اٹھایا۔ انقلاب فرانس فلسفہ وجودیت کا محرک ثابت ہوا اور بلا شبہ اس فلسفے کو جنگِ عظیم نے تحرک بخشا۔ جنگ عظیم انسان کی ذہنی شکست وریخت کا باعث ثابت ہوئی۔ صنعتی انقلاب نے جہاں آسائش وسہولت کا سامان کیا وہاں فرد کی بے چینی اور اضطراب نے بھی سر اٹھایا۔ معاشرتی نظام درہم برہم ہو گیا اور تنہائی، مایوسی اور بے چینی نے اپنے قدم جما لیے۔ جنگ عظیم میں ان گنت افراد کا مارا جانا پیچھے رہ جانے والوں کے لیے سخت تکلیف کا باعث بنا۔ ہر طرف مایوسی، بے بسی، لاچاری کے احساسات بکھرے نظر آنے لگے۔ وجودی فکر کے حوالے سے ڈاکٹر حمیرا اشفاق رقم طراز ہیں کہ ''جدید فرد سماج کو اپنی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ تصور کرنے لگا اور پھر اپنی ذات کی تلاش کے سفر پر گامزن ہوا۔ اپنے وجود کے تشخص کے لیے اس نے وجودی فکر کو اپنایا''(۱) اس مکتب فکر کے حوالے

* ٹیچنگ ریسرچ ایسوسی ایٹ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

سے بات کی جائے تو انسان کو خاص اہمیت دی گئی اور اس کی انفرادی پہچان کی تلاش کی گئی۔ وجودی فکر میں دنیا کی تمام تر اشیا پر انسان کو فوقیت و برتری دی گئی۔ اس تحریک سے منسوب بہت سے ادبا و مفکرین کے ہاں ملحدانہ تصورات نے سر اٹھایا اور وہ مذہب سے باغی ہو گئے جس کا سب سے بڑا سبب جنگ اور اس سے پیدا ہونے والے حالات تھے۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''صنعتی انقلاب سے معاشرتی ڈھانچہ شکست و ریخت کا شکار ہو گیا تھا، زرعی معاشرے میں انسان ایک خاندان ایک کل ایک مرکز کا حصہ تھا، جب وہ اپنا گاؤں، نسل اور قبیلہ چھوڑ کر شہر آ بسا تو اسے احساس تنہائی نے آ گھیرا، اسے احساس ہوا کہ جنگ میں لاکھوں، کروڑوں لوگ ایسے ہی مر گئے ہیں، ان کی کوئی شناخت، مذہب اور حوالہ نہیں تو بھلا انسانی زندگی کا کیا حوالہ ہو سکتا ہے۔ یوں انسان مذہب اور خدا کے تصور سے بھی باغی ہو گیا۔ (۲)

حالات نے انسان کو مایوس اور بے چین کیا تو وہ خدا سے منکر ہو گیا اور لادینیت کی طرف مائل ہو گیا، مایوسی اور بے چینی اس کا مقدر بن گئی لیکن جن افراد نے مذہب سے فرار حاصل نہ کی ان کی شخصیت بکھرنے سے بچ گئی۔ اس حوالے سے انور سدید اپنے افکار کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''وجودی تحریک نے یورپ کی مشینی زندگی میں گم ہوتے ہوئے انسان کو برآمد کرنے کی کوشش کی۔ تاہم انسان کا اعلیٰ منصب ماحول کی بے معنویت سے ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ نتیجہ قنوطیت اور مایوسی تھا اور فرد زندگی کو سرورِ جاوداں بنانے کی بجائے زندگی کو ختم کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ افلاطون کی مثالیت نے جوہر اور وجود کے فرق کو مٹا دیا تھا۔ چنانچہ مذاہب نے فرد کی شخصیت کو ریزہ ریزہ ہونے سے بچا لیا۔'' (۳)

ان باغیوں میں نمایاں ترین نام سارتر اور کامیو کے ہیں جنھوں نے انسان اور انسانیت کو مذہب پر فوقیت دی۔ لیکن کرکے گار، جبریل مارس، رچرڈ کرونز سمیت اکثر نے مذہب سے انحراف کی بجائے مذہب کا اعتراف کیا۔ ان کے لیے مذہب ہی سب سے اہم ہے۔ انسان کی شکست و ریخت اور دمذہب کے حوالے ان تمام اختلافات کو باوجود تمام تر وجودی مفکرین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ ''وجود جوہر پر مقدم ہے''۔ وجودی تحریک نے مغربی اذہان کو متاثر کیا تو اس کی واضح جھلک ادب میں بھی نظر آئی۔ ان افکار کی ترسیل و پیشکش وقتاً فوقتاً ادبی حوالے سے بھی ہوتی رہی ہے بقول ڈاکٹر انور سدید ''سارتر نے وجودی فلسفے کو تحرک دینے کے لیے ادب، تخلیق اور ادبی نظریات کو نئی توضیحات سے متاثر کرنے کی سعی کی۔'' (۴) اس حوالے سے سارتر، کامیو، رلکے، کافکا، دستوفسکی

سیمین دی بووائر، کولن ولسن وغیرہم کی تحریریں خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

مغرب سے اٹھنے والی اس تحریک کے اثرات اردو ادب پر بھی مرتب ہوئے اور بہت سے مصنفین ایسے موضوعات احاطہ تحریر میں لائے جن سے وجودی فکر کی ترسیل ہوئی۔ بہت سے مرد اور خواتین مصنفین کی تحریروں میں وجودی عناصر ملتے ہیں جس کا اظہار نظم و نثر دونوں پیراؤں میں ہوا۔ وجودی تحریک کے زیرِ اثر تحریر ہونے والے ادب میں مایوسی، تنہائی، بے بسی، دنیا کی بے ثباتی، اجنبیت، فرار، خدا کے وجود اور مذہب سے انکار جیسے موضوعات کی پیشکش کی گئی اور نظریات ترتیب دیے گئے۔ اردو کے مصنفین نے ان نظریات کو جوں کا توں قبول کرنے کی بجائے اپنی صورت حال کے مطابق قدرے بدلی ہوئی شکل میں اپنایا۔ مغرب میں لا دینیت کے ذریعے وجود اور تشخص کے سوال کو حل کرنے کی کوشش جاری تھی جبکہ مشرق میں اس کی جہت تصوف سے ملا دی گئی۔ ''یہ رجحان اردو ادب پر اثر انداز ہوا لیکن اس کی شکل قدرے بدل گئی کیونکہ یہ صورتحال پر زور دیتا اور اس کی تعبیر یا اشتراک کی ایک صورت تصوف سے ملا کر بھی کی گئی جبکہ سارتر کے خدا کے انکار کو ہمارے ہاں تسلیم نہ کیا گیا۔''(۵) اردو ادب کے مصنفین میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، خالدہ حسین، عبداللہ حسین، نثار عزیز بٹ، انیس ناگی، انور سجاد، فہیم اعظمی، جوگندر پال، انور سن رائے، رشید امجد، مسعود اشعر، اسد محمد خان، اعجاز راہی، احمد جاوید، انوار احمد، احمد ہمیش، انور خان، سریندر پرکاش اور بلراج منرا وغیرہم کی تصانیف میں یہ عناصر پائے جاتے ہیں۔

زیرِ نظر تحقیقی منصوبے میں رشید امجد کے افسانوں میں وجودی عناصر کا جائزہ لیا جائے گا۔ رشید امجد نے جدیدیت کے اثرات کو علامتی حوالے سے اس طرح پیش کیا کہ ان کے افسانے روایت اور جدت کا امتزاج پیش کرنے لگے۔ رشید امجد نے موضوع کے ساتھ ساتھ اس کی پیشکش پر بھی توجہ دی اور فکر و فن دونوں پر قدرت کی وجہ سے ان کے اسلوب میں شگفتگی، دل کشی، تازگی اور تاثیر پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر شفیق انجم ان کے افسانوں کے حوالے سے یوں رقم طراز ہیں:

> ''رشید امجد اپنے عہد کے ناظر بھی ہیں اور ناقد بھی۔ انھوں نے انفرادی و اجتماعی سطح پر اپنے عہد کی بے چہرگی، گم شدگی، شناخت و عدم شناخت اور جبر و کرب کی متنوع صورتوں کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔''(۶)

رشید امجد نے اپنے افسانوں میں جدید زندگی کی پیچیدگیوں اور مصنوعی پن، جذبات و احساسات اور اقدار کے زوال سے فرد پر ہونے والے اثرات کا جائزہ بخوبی لیا ہے۔ شفیق انجم کے مطابق رشید امجد نے ''فرد، اجتماع اور کائنات کی تثلیث میں ایک بڑی سطح پر اس المیے کو دیکھا دکھایا''(۷) رشید امجد کے افسانوی مجموعے

''ریت پر گرفت'' پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں کہ ''ان افسانوں میں رچی افسردگی، شک، خوف اور تنہائی کا ایک خاص پس منظر بھی ہے۔''(۸)

پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے معاشرے میں جو تباہ کاریاں ہوئیں ان کا واضح اثر فرد کے قلب و ذہن پر ہوا جو بعد ازاں فرد کی تنہائی، عدم شناخت کی صورت میں ابھرا۔ وجودی مکتب فکر سے وابستہ افراد نے انسان کی انفرادیت یعنی فرد کی شناخت کے مسئلے پر غور و فکر کیا جس کے اثرات ادب پر پڑے اور ان کا عکس مصنفین کی تحریروں میں دکھائی دیا۔ رشید امجد نے اپنے افسانوں میں فرد کی شناخت کے مسئلے کے حوالے سے بات کی اور واضح طور پر اس موضوع پر بات کی۔ ڈاکٹر شفیق انجم کے مطابق:

> ''ان کے ہاں ''وہ'' اور ''میں'' دو ایسے کردار ہیں جو اس ویرانی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کبھی ''وہ''، ''میں'' کو تلاش کرتا ہے، کبھی ''میں'' ''وہ'' کو، اور کبھی دونوں خود اپنے آپ کو تلاش کرنے لگ جاتے ہیں''(۹)

فرد کی شناخت کے مسئلے کو ڈاکٹر رشید امجد نے اپنے بیشتر افسانوں میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے افسانے ''ریت پر گرفت'' کی سطور ملاحظہ فرمائیں:

> ''اس نے اپنے چہرے کو چھوا۔
> ''میرا چہرہ وہی ہے۔''
> ''کیا پتہ وہ نہ ہو؟'' شعلہ چمکنے سے پہلے ہی بجھ گیا۔
> ''میں وہی ہوں؟''
> ''کیا واقعی؟'' لفظ پھر دھڑام سے نیچے آ گرے۔(۱۰)

اسی حوالے سے رشید امجد اپنے ایک اور افسانے ''بیزار آدم کے بیٹے'' میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''ب'' کہتا ہے... یار اگر میں ''ا'' ہوتا اور تم ''ب'' ہوتے تو کیا ہو جاتا؟
> ''کچھ بھی نہیں''... میں جواب دیتا ہوں... ''میری وگ تمھارے سر پر ہوتی اور تمھاری وگ میرے سر پر''
> ''یہ تو کوئی فرق نہ ہوا''... وہ پریشان ہو جاتا ہے... ''صرف وگیں بدلنے سے تو ہم الگ الگ نہیں ہو سکتے''(۱۱)

''نارسائی کی مٹھیوں'' میں رشید امجد یوں لکھتے ہیں:

> ''وہ چابک کھائے گھوڑے کی طرح بدک کر اپنے ملبے سے باہر نکلا... ''میں کون ہوں؟'' یہی تو وہ سوال ہے جس کا جواب مجھے معلوم نہیں''(۱۲)

درج بالا سطور میں فرد کو اپنی ذات کی تشخیص کے لیے متجسس ہوتے ہوئے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جدید دور نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ جس کی وجہ سے بے اعتنائی اور مصنوعی پن عام ہو گیا ہے۔ اور اس مصنوعی پن نے انسان کو اس قدر کھوکھلا کر دیا ہے کہ وہ کھرے کھوٹے کی تمیز بھول گیا ہے اور یہ مسئلہ اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ انسان کا خود اپنی ذات کا احاطہ کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے اور وہ اپنی پہچان کھو بیٹھا ہے۔ یہاں کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہاں اگر ''ا''، ''ج'' ہو جائے تو کسی کو حتیٰ کہ ''ا'' کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ وہ خود عدم شناخت کا شکار ہو چکا ہے۔

وجودی ادب میں انسان کی بے بسی، مجبوری و بے کسی کو بارہا موضوع بنایا گیا ہے۔ وجودی مصنفین نے اس نقطے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے اور اسی نظریے کا پرچار کیا ہے کہ انسان وقت کے بے رحم ہاتھوں انتہائی مجبور، بے بس اور لاچار ہے، انسان مسلسل بے بسی کی ایسی کیفیت سے گزر رہا ہے جہاں سے اس کے لیے نکلنا مشکل ہو گیا ہے۔ وقت کے ہاتھوں انسان کی بے بسی کی تصویر کھینچتے ہوئے رشید امجد اپنے افسانے ''تیز دھوپ میں مسلسل رقص'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ شخص پچھلے کئی سالوں سے اسی طرح زندگی کو وقت کی چرخی پر لپیٹ رہا ہے۔ صبح شام، صبح شام پھر وہی رات اور اس کے بعد وہی صبح و شام، صبح و شام'' (۱۳)

اسی طرح اس کی ایک مثال ان کے افسانے 'بیزار آدم کے بیٹے'' میں یوں ملتی ہے:

> ''دیواروں کے ساتھ ساتھ کئی گدھ پروں میں سر دیے اونگھ رہے ہیں، میرے جاتے ہی وہ پروں سے اپنی چونچیں باہر نکالتے ہیں۔ ان کی لمبی نکیلی چونچوں پر لہو جما ہوا ہے۔ جونہی میں کمرے کے وسط میں پہنچتا ہوں، وہ مجھ پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور میرا گوشت نوچنے لگتے ہیں، میں زمین پر گر پڑتا ہوں، وہ شور مچاتے، پروں کو پھڑ پھڑاتے مجھے نوچنے میں مصروف رہتے ہیں۔ میں دونوں ہاتھوں سے انھیں دھکیلنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن میرے ہاتھ حرکت نہیں کرتے۔'' (۱۴)

درج بالا سطور کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو انسان کہیں وقت کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہے اور صبح و شام کے چکر سے خود کو آزاد نہیں کر پاتا۔ تو کہیں بے رحم پرندے جو درحقیقت انسان کی طاقت سے بہت کم طاقت رکھتے ہیں، ان کی گرفت میں آ کر خود اپنا دفاع بھی نہیں کر پاتا۔

جنگ عظیم اور اس کے بعد کے مشینی دور کے حوالے سے بات کی جائے تو جنگ میں افراد کا معمولی حشرات کی طرح اس طرح مارا جانا جیسے ان کی کوئی وقعت ہی نہ ہو باقی رہ جانے والے افراد کے لیے عام معاملہ نہیں

تھا۔اور پھر مشینی دور کے اجتماع میں انسان کی انفرادیت کا گم ہو جانا اور نئے علاقے نئے حالات میں ماحول سے اجنبیت اور لاتعلقی سے اجنبیت اور لاتعلقی کے احساس نے شدت اختیار کر لی۔اس لاتعلقی ،اجنبیت اور تنہائی کا احساس رشید امجد کے افسانے ''بیزار آدم کے بیٹے'' میں یوں ملتا ہے:

''ہم تو خواہ مخواہ پریشان ہوئے جاتے ہیں ہمارا نہ کوئی گھر ہے، نہ کوئی بیوی اور نہ ہماری جیب میں کوئی کارڈ ہے''

''واقعی''...میں کہتا ہوں...ہم تو کچھ بھی نہیں صرف ''ا'' اور ''ب'' ہیں **(۱۵)**

اسی طرح ایک اور جگہ اس کی مثال یوں ملتی ہے:

''میں کہاں جاؤں؟''

''میں کہاں جاؤں؟''

(اس کا جسم بتدریج اینٹھتے ہوئے بے حرکت ہوا جا رہا تھا)

''ہر شے میرا ساتھ چھوڑ رہی ہے'' **(۱۶)**

وجودی تحریک میں انسان کو ایک مسلسل کرب سے دوچار دکھایا ہے۔جس میں وہ حالات کے آگے اس قدر معذور ہے کہ کچھ کر سکنے کی سکت نہیں رکھتا۔وہ مسلسل ایک اذیت اور کرب سے گزر رہا ہے۔ان افکار کی پیشکش رشید امجد کے افسانوں میں بھی ہوئی ہے مثال کے طور پر ان کے افسانے ''لا...؟'' میں اس کی مثال یوں ملتی ہے۔

''...اب تو یوں لگتا ہے جیسے ہر سانس کے ساتھ ہوا کی بجائے اذیت میرے اندر جاتی ہے'' **(۱۷)**

''ڈوبتی پہچان'' میں اس کی مثال یوں ملتی ہے۔

''...ماں ہنس پڑی...پگلے کہیں تصویریں بھی روتی ہیں''۔

ماں کی ہنسی...گہرے غم میں گندھی ہوئی تھی... ''غم میں گندھی مسکراہٹ پتھر ہو گئی تھی...شاید اس نے پیچھے مڑ کر دیکھ لیا ہے۔لیکن پیچھے تو گہرا اندھیرا ہو اور آگے دھند ہی دھند...'' **(۱۸)**

درج بالا سطور میں انسان کی داخلی کرب کی تصویر کشی مناسب الفاظ میں کی گئی ہے جس سے صورتحال واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے اور مصنف کی افکار کی ترسیل بھی بخوبی ہو جاتی ہے۔

حالات نے جہاں انسان کو مجبور و بے بس بنا دیا تھا وہاں ایک مسئلہ حالات و واقعات سے فرار کا بھی آیا مسائل سے اکتا کر اور کوئی حل نہ پا کر انسان نے تمام مسائل کا حل محض ایک فرار میں پایا جس کی مثال رشید امجد کے افسانے ''لا...؟'' میں یوں ملتی ہے:

''اس نے اپنے آپ کو سزا دی ہے۔
کہ زہر کا پیالہ پی لے، یا جلاوطن ہو جائے، لیکن بزدلی بچپن ہی سے اس کے دل کے آنگن میں گداں مارتی چلی آئی اور موت نے کئی بار اس کے گھر پر شب خون مارا ہے۔اس لیے اس نے جلاوطن ہونے کو ترجیح دی ہے، لیکن جانے سے پہلے وہ رشتوں کی ان تمام ڈوریوں کو کاٹ پھینکنا چاہتا ہے، جن سے اس کی زندگی کی کشتی کا مستول بندھا ہوہے''(۱۹)

مندرجہ بالا سطور میں فرد کا رشتوں اور ذمہ داریوں سے فرار کا رویہ کھل کر سامنے آتا ہے۔بیسویں صدی میں اکثر افسانہ نگاروں کے ہاں ذات کا کرب، تنہائی، وجود کی تلاش، زندگی کی بے معنویت و لا حاصلیت جیسے موضوعات ملتے ہیں۔رشید امجد نے بھی اپنے افسانوں میں ان عوامل کی پیشکش کی ہے اور یہ پیشکش یوں کی گئی ہے جیسے ان کی بازگشت ہو۔انسان کی بے بسی، لاچاری اور بے معنویت کو سمجھنا ہو تو ان کا یہ جملہ کافی ہوتا ہے کہ:

''ہاں قبر کھد جائے تو پھر لاش مانگتی ہے...!
...کوئی بھی لاش...کھدی ہوئی قبر تو بس مردہ مانگتی ہے''(۲۰)

رشید امجد معاشرتی رویوں کو اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہوئے انسانی زندگی کے حقیقی مسائل کی عکاسی کرتے ہیں۔ان کے افسانے اگرچہ وجودیت کو ایک بدیسی تحریک کے طور پر نہیں اپناتے لیکن جس معاشرے کی وہ تصویر کشی کرتے ہیں وہاں وجود اور اس کی شناخت جیسے مسائل منطقی انداز میں سامنے آتے ہیں۔اس لیے ان کی کہانیوں اور کرداروں میں فرد کی عدم شناخت، مسائل سے فرار، کرب، بے چینی، مایوسی، بے کسی، بے بسی، لاچاری، اجنبیت و تنہائی بطور موضوع پیش کیے گئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، ''جدید اردو فکشن: عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات''، سانجھ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۹۲
۲۔ ایضاً۔ص۹۲
۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۱۳ء، ص۹۳
۴۔ ایضاً۔ص۹۲
۵۔ حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، ''جدید اردو فکشن: عصری تقاضے اور بدلتے رجحانات''، ص۹۴
۶۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ؛ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں''، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص۲۶۹
۷۔ ایضاً، ص۲۶۹

۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ: ایک صدی کا قصہ''، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۴۷۱
۹۔ شفیق انجم، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ؛ بیسویں صدی کی ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تناظر میں''، ص ۲۶۹
۱۰۔ رشید امجد، ''عام آدمی کے خواب''، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۷
۱۱۔ ایضاً، ص ۱۳۰
۱۲۔ رشید امجد، ''ریت پر گرفت''، ندیم پبلشرز، راول پنڈی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۳
۱۳۔ ایضاً، ص ۶۵
۱۴۔ رشید امجد، ''عام آدمی کے خواب''، ص ۱۲۹
۱۵۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۱۶۔ ایضاً، ص ۱۰۷
۱۷۔ ایضاً، ص ۲۰۳
۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵۳
۱۹۔ رشید امجد، ''ریت پر گرفت''، ص ۲۸
۲۰۔ ایضاً